تہذیبی تشخص اور اساس کا مسئلہ

(The Problem of Cultural Identity & Base)

ڈاکٹر شاہد اشرف
Dr. Shahid Ashraf
Assistant Professor, Department of Urdu
F.C University, Lahore

Abstract:
The cultural identity and national base of a nation is always questioned. Modern world seems to be overwhelming such concept. The problems of base and identity were born in last century and there was revolution on intellectual level. Globalization considers individual identity and base as a barrier to its own path. New terms have been introduced and world powers have forced small nations to adopt common culture and civilization under their agenda. However, the nations are always reluctant to lose their cultural identity resulting in chaos and deprivation of resources being provided by the super powers. In this article the crisis of identity and the concerns of the present and future have been discussed.

Keywords:
Culture, Cultural Identity, Nationalism, National Pride, Globalization, Intellectual Revolution, Culture & Civilization.

انسانی تہذیب کا ارتقا کسی ایک خطے کا مرہون منت نہیں ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں بیک وقت خاص معاملات کے نتیجے میں تہذیب کا عمل پروان چڑھا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یورپ، ایشیا، افریقہ سمیت دیگر براعظموں میں تہذیب کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہر خطے کے لوگوں نے اپنی سماجی زندگی اور تخلیقی توانائی کو مختلف جہتوں سے متعارف کروایا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو تہذیب کا تعلق مزاج، موسم اور جغرافیے سے بھی ہے۔ انسانی ضروریات اور سماجی اقدار نے تہذیب کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ پیداواری عمل اسے مہمیز دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں تہذیبی ارتقا میں مدد ملتی ہے۔ برصغیر کے تہذیبی ارتقا میں آریاؤں کی آمد سے انگریزوں کی یلغار تک ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ اس سے پہلے ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے تہذیبی اثرات بھی موجود

ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ کسی خاص خطے کے علم و فلسفہ، فنون لطیفہ زبان و ادب، اخلاقیات، رسم و رواج، رہن سہن تہوار اور دیگر عوامل مل کر تہذیبی تشکیل میں مدد دیتے ہیں۔ برصغیر ایک ملک نہیں تھا بلکہ یہ کئی ملکوں کا مجموعہ تھا۔ فاصلے زیادہ تھے اور لوگوں کے مابین باہمی ربط کم تھا۔ اس لیے کئی مختلف عوامل بیک وقت پروان چڑھ رہے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ آریاؤں، یونانیوں، عربوں، ترکوں، ایرانیوں اور انگریزوں کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ تہذیب ایک ارتقائی عمل کا نام ہے۔ اس ارتقا میں اندرونی و بیرونی عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ یوں ہم پاکستانی تہذیب کے تناظر میں مشترکہ ہندوستانی تہذیب کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔ الگ ملک اور مذہب کے باوجود تہذیبی سرمائے کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ الگ تہذیبی تشخص کی کوشش ضرور نظر آتی ہے۔ اس تہذیبی تشخص سے اساس نے جنم لیا ہے۔ تشخص اور اساس دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

اقوامِ عالم کی تاریخ کے مختلف ادوار کو دستاویزی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ان ادوار کو عام طور پر اولڈ، مڈل ایج اور ماڈرن کے حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ تاریخی مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آغاز ہی سے انسان نئی دُنیاؤں کی جستجو میں رہا ہے۔ بعد میں اس جستجو کی نوعیت تجارتی حیثیت میں سامنے آئی۔ فکر و فلسفہ، علوم و فنون اور نظریہ و مذہب ایک خطے سے دوسرے خطے میں منتقل ہوئے۔ اس انتقال نے انسان کی سوچ کو مہمیز لگا دی اور یوں بتدریج اُس کی اساس مستحکم ہونے لگی۔ میرے نزدیک اساس فکر، فلسفہ، نظریہ، عقیدہ، ازم اور مذہب کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ یعنی اساس کسی خاص تصور کے نتیجے میں تشکیل پاتی ہے۔ اس کی نوعیت روحانی، شخصی اور نظری ہو سکتی ہے۔ جوں جوں انسانی ارتقا میں اضافہ ہوا توں توں اساس کے نئے مظاہر سامنے آئے اور کئی فرسودہ، غیر منطقی اور غیر عقلی بنیادیں ختم ہو گئیں۔ از منۂ قدیم کے کئی مذاہب نے دم توڑ دیا اور فلسفے کے رجحان نے انسانی ذہن کو نئے سانچے عطا کر دیے۔ اساس کا استحکام ذہنی قبولیت کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور انسانی ذہن کئی تصورات کو از خود ہی غیر متعلقہ قرار دے کر کنارے پر لگا دیتا ہے۔ بالکل جیسے بہتا پانی اشیا کو کنارے پر لگا کر اپنی روانی کو برقرار رکھتا ہے۔

عموماً ہر اساس کے پیروکار بنیاد پرست، معتدل اور صرف نام کے حامل لوگوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کوئی شک نہیں تینوں گروہ ہر عقیدہ و نظریہ میں آسانی سے دیکھے جاسکتے ہیں۔ عقیدہ و نظریہ تبدیل بھی ہوتا ہے اور اسی نتیجے میں مذہب فروغ پاتا ہے یا ازم کی ترقی ہوتی ہے۔ مذاہب اور نظریات کے فروغ میں انسانی میلان، معیشت اور معروضی حالات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس کی ایک نوعیت مختلف ادوار میں جبر و خوف اور مفاد و طمع بھی رہی ہے۔ تبلیغ و اشاعت اور ترجیح و میلان سے بھی فکری اساس متاثر ہوتی ہے۔ نو آبادیاتی زمانے میں یہ صورتیں خاص طور پر ملتی ہیں۔ جنگ، قحط اور آفات کے بعد انسانی بقا کا خوف اساس کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ مختلف تھیوریز افراد خصوصاً طالب علموں کی فکری تربیت انجام

دیتی ہیں۔ اس نتیجے میں اُن کی نظری اور مذہبی اساس میں تبدیلی کا رجحان دیکھنے میں آتا ہے۔ جب تک دنیا میں پاسپورٹ کا باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا، لوگ روزگار، کاروبار، تعلیم اور مختلف معاملات کے سلسلے میں دوسرے خطوں کا سفر کرتے تھے۔ بعض جزوی یا کلی سکونت بھی اختیار کرتے تھے۔ پاسپورٹ کے نفاذ اور سرحدوں کے تعین کے نتیجے میں شہریت اور شناخت پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس کا تصور پہلے سے موجود تھا مگر اس کی نوعیت براعظم یعنی افریقہ، ایشیا، یورپ وغیرہ کے تناظر میں زیرِ بحث آتی تھی۔ میرے نزدیک شناخت کا تعلق، نام، زبان، ذات، ملک، قوم اور خطے سے ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کسی فرد کی پہچان میں مدد ملتی ہے۔ مختلف ملکوں میں جزوی یا کُلی سکونت کی وجہ سے دو مختلف مذاہب اور اقوام کے افراد کے مابین شادیاں انجام پانے لگیں۔ یعنی اساس اور شناخت کے مدغم ہونے کی وجہ سے پہلے جیسی شناخت کے بجائے نئی شناخت سامنے آئی جس کی مثال اینگلو انڈین کی صورت میں دی جاسکتی ہے۔ ایک ہی مُلک میں مختلف اقوام کے مابین شادیوں کی وجہ سے بھی دوہری شناخت کا تصور اُبھرنے لگا۔ اس کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اس سے مذہبی تعصب ختم کرنے میں مدد ملی ہے۔ ویسے بھی ریاست میں مذہب کا تصور متنازعہ سمجھا جاتا ہے:

> ”فرد اور ریاست پر غور کرتے وقت ہم کو تیسرے عنصر یعنی مذہب کو نظر انداز کرنا پڑے گا۔ ریاست میں فرد کی حیثیت شہری کیہوتی ہے اور اس کے شہری حقوق مذہبی عقاید سے متعین نہیں ہوتے۔ ریاست کی نظر میں ہندو، مسلمان، عیسائی، پارسی شہری ہونے کیحیثیت سے برابر ہوتے ہیں۔“(۱)

موجودہ صورتِ حال میں اساس اور شناخت کی نوعیت خاصی دلچسپ اور متبدل دکھائی دیتی ہے۔ مابعد تصورات اور سائنسی طرزِ فکر عام ہوگئی ہے۔ مذہبی اور نظری تصورات پر سوالیہ نشان لگایا جانے لگا ہے۔ غیر سائنسی افکار دم توڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ اساس کی نئی صورت سیکولر، لبرل، اتھیسٹ وغیرہ قرار دی جاسکتی ہے، لیکن اس کا ہرگزیہ مطلب نہیں ہے کہ اساس کی مذہبی صورت موجود نہیں ہے۔ چوں کہ اساس فکری نہج پر اُستوار ہوتی ہے اور انسان وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ نئی توجیح اور قبولیت پیدا کرلیتا ہے اس لیے موجود سے ممکنہ حد تک ہم آہنگ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اساس کے قدیم تصورات اُس کے رستے میں رکاوٹ بنتے ہیں اور کہیں کہیں ٹکراؤ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ کی نوعیت مکالماتی یا علمی ہو تو صحت مندانہ سرگرمیاں تشکیل پاتی ہیں وگرنہ معاشرتی خلفشار، ذہنی انتشار اور ناموافق حالات جنم لیتے ہیں۔ اس وقت اساس اور شناخت گڈ مڈ ہوتے جارہے ہیں۔ دُنیا گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔ ایک کلک کے ذریعے آپ کہیں بھی پہنچ سکتے ہیں۔ جن ملکوں نے اساس کے نئے تصور کو اپنا لیا وہ اساس اور شناخت کے بُحران کا شکار ہونے سے بچ گئے ہیں۔

اساس کے فکری اور شناخت کے شخصی پہلوئوں کا معاملہ کئی اعتبار سے دل چسپ ہے۔ عام طور پر دیکھنے میں آتا

ہے کہ مذہبی تہواروں کے موقعوں پر عام آدمی کا رجحان مذہبی ہوتا ہے اور بعد میں سیکولر، لبرل یا ماڈرن ہو سکتا ہے۔ مجھے ایک ادیب یاد آتا ہے جو ببانگِ دُہل اتھیسٹ ہونے کا اعلان کرتا تھا مگر دس محرّم کو ماتم بھی کرتا تھا۔ یوں اساس کا حیران کُن پہلو دیکھنے میں آتا ہے۔ یہی معاملہ شناخت کا بھی ہے۔ مثلاً ایک عام پاکستانی کی اساس اور شناخت کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ وہ بہ یک وقت ایشیائی، مسلم، سیولر، پاکستانی، پنجابی، بریلوی، راجپوت وغیرہ ہوتا ہے۔ یہی معاملہ دُنیا بھر میں دیکھا جا سکتا ہے بلکہ یورپ اور امریکہ میں اس سے بھی زیادہ دل چسپ صورتِ حال موجود ہے۔ یورپ میں نیشنل اِزم کا تصور بہت مضبوط تھا۔ یورپ میں یورو کرنسی کے قیام اور ویزے کے بغیر آمدورفت کی وجہ سے بتدریج اساس و شناخت کا معاملہ خاصا کمزور پڑ گیا ہے۔ یورپ کی گزشتہ صدی میں تیز رفتار ترقی نے مُلکوں کو قریب لانے اور امن کے قیام میں مدد دی ہے:

> ”زرعی انقلاب کے بعد صنعتی انقلاب کو تاریخ عالم میں سب سے اہم سنگ میل سمجھا جاتا ہے۔ جس طرح زرعی انقلاب شکار کے عہد کی قدروں کو بدل دیتا ہے۔ اسی طرح صنعتی انقلاب کے ہمہ گیر شیوع سے زرعی معاشرے کی دس ہزار سالہ برس کی پرانی قدریں اور روایات نامحسوس طور پر بدلتی جا رہی ہیں۔“(۲)

اِس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مادی وسائل میں اضافہ ایک عام شخص کو کئی قومیتی، نسلی، مذہبی، فروعی مسائل کی طرف مائل ہونے سے روکتا ہے اور اُس کی توجہ وسائل بڑھانے میں صرف ہونے لگتی ہے۔ البتہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سیاسی سطح پر نیشنل اِزم کو فروغ دے کر مفاد حاصل کرنے کا رجحان ہر عہد میں موجود رہا ہے۔ ترکی کے خلاف عرب نیشنل اِزم کو استعمال کیا گیا اور اس میں خاص کامیابی حاصل ہوئی۔ پاکستان میں بلوچ اور پختون، سندھی قومیت کو سیاسی مقاصد کے لیے بروئے کار لایا جاتا رہا ہے۔ اس طرح دُنیا کے مختلف ملکوں میں اندرونی و بیرونی قوتیں اپنے مقاصد کے لیے فرقہ وارانہ، قومیتی اور لسانی کارڈز کو استعمال کرتی ہیں۔ نو آبادیاتی دور میں 'لڑاؤ اور حکومت کرو' کی پالیسی کے پسِ پردہ اساس اور شناخت کے مختلف کارڈز کو کامیابی سے کھیلا گیا۔ اِس سلسلے میں اُردو ہندی تنازعہ، شدّھی اور سنگھٹن کی تحریک سمیت سیکڑوں ہندو مسلم واضح اور غیر واضح تنازعات کی حقیقت یہی مسئلہ ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے شناخت کے بُحران کا غوغا سُنائی دیتا رہا ہے۔ اس تناظر میں تاریخ اور ثقافت کو بطور ٹول استعمال کیا گیا اور اپنی جڑوں کی تلاش میں شناخت کو پیشِ نظر رکھ کر اساس سے پہلو تہی اختیار کی گئی۔ یوں موجود سے لاتعلقی اور ماضی سے نسبت پر زور دیا جانے لگا۔ اس بُحران کا پاکستانیت اور اسلام کی بُنیادوں کے ذریعے مقابلہ کرنے کی کوشش ہنوز جاری ہے:

> ”جدید مملکت کا دعوی ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں بالکل غیر جانب دار ہے اور امر سے بحث نہیں کہ اس کے ارکان مذہب کیا ہیں؟ وہ کس کی عبادت کرتے ہیں اور کیوں؟

مملکت کے افراد کا ہم مذہب ہونا بھی ضروری نہیں۔"(۳)

اقبال نے شناخت کو جزوی قرار دے کر اساس کو کُلی حیثیت سے متعارف کرایا ہے۔ وہ رنگ، نسل، زبان، قومیت کو صرف ظاہری شناخت قرار دیتے ہیں اور اُن کے نزدیک مذہبی اساس کو تمام شناختوں پر فوقیت حاصل ہے۔ وہ مذہب کے ماننے والوں کو قوم سمجھتے ہیں اور سرحدوں سے باہر تمام دُنیا میں اسلام کے ماننے والوں کو ملّت کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ نظریہ ایک فرد کو اقوامِ عالم میں مذہب کے تمام پیروکاروں سے جوڑ دیتا ہے۔ پان اسلام اِزم کی تحریک میں بھی یہی نکتہ پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ کیا مذہب آئندہ انسان کی زندگی کو کس حد تک متاثر کر سکتا ہے اور انسان اسے کس حد تک قبول کرے گا:

"مستقبل میں مذہب کی بقا کا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ کس حد تکانسان کی متبدلہ زندگی کے تمام طبعی تقاضوں کو پیش نظر رکھتا ہے اوراس کا قابل عمل اور کارگر حل پیش کرتا ہے۔"(۴)

آئندہ صدی میں تہذیبی شناخت اور اساس کا بحران جاری رہے گا۔ متحارب نظریات کی کشمکش میں سوشل میڈیا کا کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ففتھ جنریشن وار میں بنیادی ٹارگٹ اساس اور شناخت کو بنایا گیا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ عالم گیریت میں الگ شناخت اور اساس قابل قبول نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے مسایل پیدا ہوتے ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ ایک طرف تو عالم گیریت کو فروغ دیا جا رہا ہے تا کہ کاروبار میں وسعت ہو دوسری طرف علاقائی اور جزوی شناخت کی حمایت کی جاتی ہے تا کہ قومی وحدت کو توڑا جائے۔

مختلف ملکوں میں اس وار کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی واضح پالیسی دکھائی نہیں دیتی ہے۔ پاکستان میں یہ مسئلہ زیادہ گھمبیر نہیں ہے البتہ روز بروز اس اثرات بڑھ رہے ہیں۔ آہستہ آہستہ وابستگی میں کمی واقع ہو رہی ہے اور یہ اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ آئندہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے موجودہ کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی، کا تصور کتنا کارگر ثابت ہو سکتا ہے، اس کے بارے میں وقت فیصلہ کرے گا۔

"اسلام صحیح معنوں میں انقلاب تھا، وہ دنیائے کہن کی موت اور عالم جدید کی تکوین تھی۔
دین اور ضمیر کے معالمے میں ہر قسم کا جبر ممنوع ہو گیا۔"(۵)

میرا خیال ہے کہ اساس کا مسئلہ باقی اقوام کی نسبت مسلمان خاص طور پر پاکستانی زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ اس حوالے سے دنیا کو پریشانی لاحق نہیں ہونی چاہئے۔ بلکہ انسانی سطح پر اسے ایک جداگانہ موقف قرار دے کر قبول کر لینا چاہیے۔ اصل مسئلہ پاکستان میں قومی اور علاقائی تہذیب کا ہے۔ کسی سطحوں پر قومی اور علاقائی باہم متصادم بھی ہیں۔ اس وجہ سے وحدت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سبط حسن اس مسئلے پر یوں رائے دیتے ہیں۔

"اس صنعتی تہذیب کے دور میں ہماری قومی تہذیب اور علاقائی تہذیبوں کا انجام کیا ہو گا۔
قومی تہذیب کی شخصیت کا تو ابھی تک سراغ نہیں ملا ہے۔"(٦)

پاکستان میں تہذیبی بحران شروع دن سے پیدا ہو گیا تھا اور بتدریج اس میں اضافہ دیکھنے میں آتا رہا ہے۔ اس کے اندرونی و بیرونی محرکات سے قطع نظر ملکی سطح پر اس بحران پر مکالمے کی از حد ضرورت ہے۔ وگرنہ یہ بحران کسی بڑی تباہی کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سبط حسن، نوید فکر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۱۱ء، ص:۱۵۵
۲۔ علی عباس جلال پوری، روح عصر، لاہور: تخلیقات، ۱۹۹۹ء، ص:۱۱۹
۳۔ یوسف حسن خان، ڈاکٹر، روح اقبال، لاہور: القمر انٹرپرائزز، ۲۰۱۰ء، ص:۳۳۹
۴۔ احمد عبداللہ، مذاہب عالم، لاہور: مکی دارالکتب، ۲۰۰۲ء، ص:۲۲
۵۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکر اقبال، لاہور: بزم اقبال، ۱۹۸۸ء، ص:۶۵۹
٦۔ سبط حسن، پاکستان می تہذیب کا ارتقا، کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۸۹ء، ص:۴۱۱